دنیا آخرت کی کھیتی ہے

موعظہ: آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ ربّ العالمین والصّلوٰۃ علی سید المر سلین وآلہ الطّاھرین الا ، انّ الیوم المضمار و غد السّباق والسیقۃ الجنّۃ والغایۃ النّار

یہ مقدس فقرات جن سے میں نے اپنے کلام کی ابتدا کی ہے اس حکیم ربانی کے ہیں جس نے دنیا وآخرت دونوں کو اس مکمل صورت پر اہل عالم کے سامنے پیش کیا ہے جو انسان کا معیار کمال ہے اور میرا موضوع بھی درحقیقت ان دونوں چیزوں کے متعلق ہے الدنیا مزرعۃ الآخرۃ۔ یعنی دنیا کھیتی ہے آخرت کی۔ دنیا اور آخرت کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔ ایک ان میں سے پیش خیمہ اور دوسرا اس کا نتیجہ ۔ اس کو امیر المومنین علیہ السلام ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ آج کا دن مضمار یعنی تیاری کا میدان ہے، اور کل گھوڑ دوڑ ہے۔ آگے جانے والے کے لیے جو انعام مقرر ہے وہ جنت ہے اور آخری منزل جو بعض لوگوں کی ہوگی وہ نار ہے۔ درحقیقت وہ حدیث اور یہ جو امیر المومنین علیہ السلام کا کلام ہے اس میں افراد انسانی کے سامنے دو چیزیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک زندگی کا ماحصل اور دوسرے کامیابی کا حقیقی معیار۔ اس کے ضمن میں وہ بہت سی چیزیں آجاتی ہیں کہ جن کو اس وقت دنیا اجنبیت کے ساتھ دیکھ رہی ہے ۔ اگر عملی اعتبار سے اس کو دیکھا جائے تو انسانوں میں ۹۹ رفیصد وہ افراد نکلیں گے جنہوں نے حیات دنیا کا ماحصل دنیا میں محدود سمجھ لیا ہے۔ اور اس کے آگے کسی چیز تک ان کا خیال پرواز نہیں کرتا ۔ اور اگر لفظی حیثیت سے وہ مانتے بھی ہیں تو ان کا عمل شک وشبہ اور کم از کم بے اعتنائی کا آئینہ دار ہے ۔ لیکن درحقیقت اگر غور کیجئے تو انسانیت کی ما بہ الامتیاز یہی چیز ہے کہ اس دنیا کی محدود فضا کے آگے انسان کی نظر جا سکے، جو ان حواس کے احاطوں کے باہر ہو یہ جو عام افراد نے معیاری ترقی سمجھ رکھا ہے اور کامیابی اور سربلندی کا تخیل قائم کر لیا ہے وہ اگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو انسانیت کے حدود سے پیچھے ہے۔ یعنی وہ چیز جس کو اس وقت نقطہ آخر ترقی سمجھا جاتا ہے وہ انسانیت کے ابتدائی نقطہ سے پہلے ہے۔

میرا موضوع مستقل طور پر یہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن جہاں تک میرے موضوع کے لیے ناگزیر ہے بیان کرنا ضروری ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ انسان سے پست جتنے مراتب ہیں جمادات سے لیکر آگے بڑھئے اور حیوانات تک پہنچئے ہر ایک اپنے ساتھ ایک جوہر لاتا ہے۔ سب سے پہلی منزل کنکر پتھر وغیرہ کی ہے اس میں صرف اپنے سرمایۂ ہستی کی حفاظت ہے یعنی اپنے اجزا کو مجتمع کئے رہنا۔ یہ چیز ہے جس کا نام جسمیت ہے۔ اس کے آگے دوسری منزل آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرعت کے ساتھ اس کے آگے بڑھنا مگر بغیر سمجھے بوجھے اور یہ نباتات کی حد ہے۔ اس کے آگے تیسری منزل آتی ہے حیوانات کی جس میں دونوں جوہر موجود۔ اور اس کے ساتھ قوت احساس

اورحرکت ارادی یعنی سمجھنا محسوسات کو اور اپنے مطلب کی بات چاہنا۔ یہ دونوں چیزیں ہیں جن کو حس اور ارادہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اگر علم وعمل جو عام انسانوں کا معیار امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے نام ہے کچھ نہ کچھ جاننے اور کچھ نہ کچھ کرنے کا تو یہ جو ہر حیوانات میں بھی موجود ہے۔ لہذا ان میں علم اور عمل دونوں ہیں۔ یعنی جو چیز آنکھ کے سامنے آئی اس کو آنکھ دیکھ لیتی ہے قوت سامعہ آواز سن سکتی ہے قوت شامہ خوشبو اور بدبودار میں امتیاز کرسکتی ہے۔ قوت ذائقہ لذّت کا احساس کرسکتی ہے۔ جہاں تک کہ احساسات کا دائرہ ہے اس کا جو ہر حیوانات میں موجود ہے۔ اس طرح جہاں تک ارادہ اور حرکت کا تعلق ہے ان میں عمل بھی ہے۔ کیونکہ عمل کے معنی ہیں کام کے اور ظاہر ہے کہ کھانا۔ پینا اپنی غذا کو حاصل کرنا اپنے دشمن پر غلبہ پانا۔ اپنے سے کمزور پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اپنی طاقت کو بالا رکھنا دوسرے کو اپنے سے پست سمجھ کر اس پر تفوق حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ تمام باتیں اگر انسان میں موجود ہیں تو حیوانات میں زیادہ ہیں۔ میں نے مانا کہ انسان کوئی اور نوع نہ سہی اور اسی سلسلہ انوار کی ایک ترقی یافتہ فرد سہی جو کہ انقلاب طبعی کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ مغربی فلسفی ڈارون کا خیال ہے اگر اس نظریہ کو صحیح بھی مانا جائے پھر بھی اس نے انسان کو سلسلہ انواع کی ترقی یافتہ انواع قرار دیا ہے۔ لہٰذا انسان میں اگر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اوروں میں نہ ہو۔ تو کم سے کم وہ باتیں جو دوسروں میں موجود ہیں ان کو ترقی یافتہ شکل جن انسان کے اندر ہونا چاہئے۔ لیکن جو چیزیں انسان کے علاوہ دوسروں کے پاس ہیں ان میں دیکھتا ہوں کہ انسان بہت سے اپنے پیش روؤں سے پیچھے ہے۔ علم اگر ادراک کا نام ہے تو چاہئے ادراک اس میں زیادہ ہو۔ انسان کی نظر چاہئے کہ تمام اپنے ہم جنس اور شرکاء میں سب سے زیادہ قوت رکھتی ہو۔ انسان کی قوت شامہ اپنے ہم جنس حیوانات میں سب سے زیادہ قوی ہو اسی طرح سے قوت سامعہ اور قوت ذائقہ بھی بڑھی ہوئی مگر جب ہم ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو ان قوتوں میں پست سے پست اور چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کو بھی ہم انسان سے برتر اور افضل پاتے ہیں۔ قوت بصارت اکثر حیوانات میں انسان سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح قوت سامعہ، قوت ذائقہ، قوت لامسہ، قوت شامہ، ہر صفت میں حیوان انسان سے برتر ہے۔ آپ اگر ادویہ کے خواص پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ حیوات کا علم انسان سے بڑھا ہوا ہے اکثر چیزوں اور مشاہدوں میں انسان حیوانات کا شاگرد ہے۔ اگر انسانی علم درحقیقت قوت مشاہدہ کا بڑھانا ہے تو اس بنا پر انسان کو پست قرار دینا چاہئے۔

انسان جسمانیت میں اپنے تئیں دیکھے تو اُس سے بہت زیادہ جسیم حیوانات دکھلائی دیں گے۔ اگر نشوونما کے اعتبار سے دیکھئے تو اس سے زیادہ تیز بڑھنے والے مخلوق نظر آئیں گے۔ اگر علم کے اعتبار سے دیکھئے تو جتنے حیوانات ہیں اس میں سے اکثر انسان کے آگے نظر آئیں گے۔ پھر انسان کا امتیاز کس بات پر ہے۔ اسی طرح عمل کو دیکھئے۔ اگر عمل نام ہے پسند خاطر اشیاء کا حاصل کرنا اور ناگوار طبع چیز کا دور کرنا تو اسباب میں بھی انسان حیوان کے پیچھے ہے۔ اس بناء پر جب انسان کو امتیازی شان سے پیش کرتے ہیں تو آپ کو ان اوصاف میں ضرورت ہوتی ہے کہ انسان کو حیوان سے تشبیہ دیں کیونکہ تشبیہ سے مشبہ بہ کو اکمل ہونا چاہئے۔

آپ کو قوت میں شیر سے تشبیہ دینا ہوتی ہے حملہ آوری میں کتے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مکاری میں روباہ سے اسی طرح مختلف چیزوں میں ان حیوانات سے تشبیہ دینا ہوتی ہے۔ اگر یہ چیزیں معیار کمال ہیں۔ تو حیوانات آگے ہیں اور آپ پیچھے تو پھر وہ علم وعمل کون سا ہے جو انسان کو حیوان سے بلند قرار دے

۔جس میں کہ انسان کی مثال انسان ہی سے ملے۔اور حیوان کی مثال نہ قرار پا سکے۔وہ چیز کہ جہاں سے انسانیت شروع ہوتی ہے وہ یہی ہے۔اب آپ ملاحظہ فرمایئے کہ دنیا نے جس چیز کو علم وعمل سمجھ رکھا ہے وہ انسانیت کے حدود سے پیچھے ہے یا نہیں؟ وہ دنیا جس میں یہ صدا گونج رہی ہے کہ جو چیز آنکھوں سے دیکھنے کے قابل نہ ہو وہ ماننے کے قابل نہیں ہے۔وہ دنیا کہ جو فخر کر رہی ہے کہ ہمارا علم مشاہدات پر مبنی ہے اور ہم مشاہدات کے آگے کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حیوانات کے قید خانہ میں اسیر ہونے کو سرمایہ افتخار سمجھے۔حیوانی علم تھا احساس۔اس کی ترقی آج وہ ہے جس کو دنیا علم کے نام سے یاد کر رہی ہے۔پہلے پانی کے اندر کے جراثیم نہیں دکھلائی دیتے تھے۔اب ہم ان کو دیکھ لیتے ہیں۔پہلے فضا کے اندر کے منتشر ذرّے ہماری نظر میں نہیں آتے تھے۔اب ہم ان کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔پہلے ہم دور کی آواز کو نہیں سن سکتے تھے،اب ہم مشرق میں بیٹھ کر مغرب کی آواز کو سن سکتے ہیں پہلے ہم فضا اور ہوائی چیزوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے اب ہم سمجھ لیتے ہیں تو کیا ہوا۔احساس کے اضافہ پر فخر ہوا۔پھر بھی ہم کہیں گے کہ اب بھی ہم حیوان سے پیچھے ہیں۔کیونکہ حیوان نے آپ سے زیادہ دیکھا۔آپ سے زیادہ سنا اور آپ سے زیادہ امتیاز کیا اور بلا جمادات کی مدد کے جو کچھ محسوس کیا خود اپنی طاقت نظر سے خود اپنی طاقتِ شامّہ سے خود اپنی طاقت لامسہ سے۔اگر ہم اپنی نظر کو اتنا قوی بنا لیتے کہ وہ جراثیم آپ کو دیکھ سکتے تو میں سمجھتا کہ ہم میں کوئی ترقی ہوئی۔مگر آپ کی نظر تو اتنی ہی اب بھی محدود ہے جتنی پہلے تھی۔یہ اس شیشہ کا کمال ہے کہ جس کی مدد سے آپ ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں۔تو آپ اپنی تعریف نہ کیجئے کہ ہم نے ترقی کی ہے۔تعریف اب بھی اس کی کیجئے جس نے جمادات میں یہ خواص ودیعت کر دیئے ہیں جو ہماری قوت مشاہدہ کی فیض رسانی سے محروم ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ غرور انسانی کے لیے ایک ٹھوکر ہے کیونکہ انسان اگر ترقی کرتا ہے تو مخلوقات کی مدد سے اور جب وہ ترقی میں مخلوقات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے تو خالق کائنات سے کیسے ہوسکتا ہے،قوت سامعہ نے ترقی کی۔بہت دور کی آواز سنائی دی۔باصرہ نے ترقی کی، پانی کے جراثیم دکھلائی دیئے۔درحقیقت یہ فخر ہے اپنی جہالت پر۔کیا فضا کے اندر یہ برقی لہریں پہلے نہ تھیں۔؟

کیا پانی کے یہ کیڑے پہلے نہ تھے۔کیا یہ تمام چیزیں جن کا انکشاف اب ہو رہا ہے پہلے موجود نہ تھیں،اب ہوئی ہیں؟ کہیئے گا کہ یہ ہمیشہ سے تھیں۔مگر ہم پہلے سے نہ جانتے تھے۔تو اب بتلایئے کہ ابتدائی نقطۂ انسانیت سے اس وقت تک کتنی ہزار صدیاں گزریں اور اتنی صدیوں تک ہم ان چیزوں سے بالکل ناواقف اور نابلد رہے خوشیاں ہو رہی ہیں۔اس بات کی کہ جو چیزیں اتنی مدت تک ہم نہیں جانتے تھے ان کو لاکھوں برس بعد ہم جان گئے جن کہ نادیدہ چیزیں ہزاروں اور لاکھوں برس تک غیر معلوم رہ سکتی ہیں اور وہ اتنی طویل مدت کے بعد دائرہ علم میں آتی ہیں تو ہم کو کیا حق ہے کہ جس چیز کو ہم نہیں دیکھ سکتے اس سے ہم انکار کر دیں۔یہ ہونے والے انکشاف خود انسان کی جہالت کا پتہ دیتے ہیں۔اتنے معلومات حاصل ہونے کے بعد اب ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس سے بہت کم ہے جو اب بھی ہم نہیں جانتے تحقیقات کے دروازے جب کھلے تو دنیا کی آنکھیں کھلیں۔اور یہ راز سربستہ ظاہر ہوا لیکن اس خدا کا کلام جس نے یہ اسرار ودیعت کر دیئے تھے جن کو ہم نہیں جانتے تھے اسنے ہماری قوت تحقیق کو یہ کہہ کر بیدار کر دیا تھا کہ ما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔جو کچھ ہم کو علم ملا وہ بہت کم ہے۔یہ ہے وہ ناقص انسانی علم جس کے اوپر اس

وقت فخر کیا جا رہا ہے۔ پھر آخر وہ علم کون سا ہے جو ان کے لیے درحقیقت خصوصی حیثیت سے امتیاز کا باعث ہوسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان محسوسات کے دائرہ کے آگے مشاہدات کی دنیا کے ماورا احساسات کی چہار دیواریوں کے اس طرف کچھ ایسی چیزیں بھی سمجھے کہ جن کے دیکھنے سے اس کی آنکھیں قاصر جن کے سننے سے اس کے کان بے بہرہ۔ جن کے چھونے سے اس کے ہاتھ مجبور، یعنی ان تمام احساسات کے حدود کے آگے ترقی کرے۔ یہ انسانی علم کہلائے گا۔ اس کے تحت میں کلیات آتے ہیں۔ کیونکہ کلیہ ہمیشہ اپنے کلیت سمیت احاطہ احساس سے باہر ہے یعنی وہ جو دنیا میں ان دیکھی باتوں کا ماننا اپنی قوت عقلی کے لیے ننگ سمجھتے ہیں۔ انکو دنیا کے کلیات سے بالکل انکار کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ کلیہ اپنی کلیت کے ساتھ تجربہ کے احاطہ اور مشاہدہ کے حدود سے آگے ہے۔ مثال کے طور پر حساب کا کلیہ سہی۔ یہ وہ علم ہے جو کہ احساس سے نہایت قریب ہے اس لیے اس کے کلیوں میں بھی غلطی بہت کم واقع ہوتی ہے۔ حساب کا کلیہ یہ ہے کہ ۳۔ اور ۳ کا مجموعہ ۶ ہوتا ہے۔ مگر جس شخص نے یہ کلیہ بنایا ہے اس سے مجھے سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ تم نے یہ کلیہ کیسے قائم کیا ہے ۳ اور ۳ کا مجموعہ ۶ ہی ہوگا۔ اور اس کے آگے نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک تجربہ کا تعلق ہے ۳ آدمی اور ۳ آدمی جمع کیئے گئے تو ۶ ہوئے اور ۳ اور ۳ دانے تسبیح کے شمار کئے گئے تو ۶ ہوئے اور اسی طرح ہزار دو ہزار خصوصی چیزیں اس طرح کی مان لی جائیں۔ یہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے میں کہوں گا ممکن ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور شئے ہو کہ جس میں ۳ اور ۳ کا مجموعہ ۸ ہوتا ہے۔ کیونکہ تجربہ ہمیشہ محدود ہے چند فردین آپ نے اتفاق سے دیکھیں کہ جہاں ۳ اور ۳ کا مجموعہ ۶ ہے، لیکن بہت ممکن ہے کہ کوئی دنیا ایسی ہو جہاں ۳ اور ۳ کا مجموعہ ۸ ہوسکتا ہو۔ ۳ اور ۳ کا مجموعہ ۹ ہوسکتا ہو۔ آپ اپنی عمر اس میں صرف کریں کہ ۳ اور ۳ کا مجموعہ شمار کریں لیکن پھر بھی آپ کا تجربہ محدود ہے۔ اور کلیہ ہوتا ہے لامحدود۔ اور اپنی لامحدود حیثیت سے آپ کے مشاہدات سے آگے ہے۔ یہ کہ ۳ اور ۳ کا مجموعہ ۶ ہوگا یہ چیز جب تک آپ احساس سے قطع نظر کر کے عقل سے نہ دریافت کر لیں اس وقت تک یہ کلیہ بن ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹروں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ بخار دریافت کرنے کے سلسلہ میں تھرمامیٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ اس سے بخار دریافت کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کیونکر سمجھے کہ بخار اتنے درجہ پر ہے اگر میں دریافت کروں کہ بخار کا آپ نے جتنا اندازہ لگایا ہے اس سے ممکن ہے زیادہ ہو تو آپ کہیئے گا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو دیکھا ہے اور سب میں اتنے درجہ پر پارہ پہنچنے کی صورت میں اتنا ہی بخار پایا۔ لیکن ممکن ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بھی ہو اور اس میں وہ بات نہ ہو۔ اس کا جواب کوئی نہیں ہوگا، جب تک کہ حرارت اور پارہ کی رفتار میں ایک خاص نسبت کے ساتھ ''کلیہ'' کے طور پر تلازم نہ ثابت ہو۔ اور یہ تلازم حدود مشاہدہ سے بالاتر ہی چیز ہے۔ احساس تو صرف وقوع کو بتلاتا ہے۔ لیکن واقعات کے اندر ارتباط یہ حسی چیز نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ حدود احساس سے باہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دیکھی باتوں کا انکار کر کے آپ زندگی میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ جب تک کہ ان دیکھی باتوں کا آپ نے اعتبار نہیں کیا، کسی دنیا کے علم وفن اور صنعت وحرفت کی بنیاد نہیں قرار پا سکتی۔ کیونکہ صنایع کی بنیاد بھی کلیات پر ہے۔ کلّیہ ہمیشہ حدود احساس سے بالاتر ہے۔ معلوم ہوا کہ انسانیت کی سرحد بیان سے شروع ہوتی ہے کہ انسان احساس کا پابند نہ رہے۔ احساس کے حدود کے آگے سے انسانیت کی منزل ہے۔ جہاں تک کہ مادّی شکست وریخت کے علم کا تعلق ہے وہ حیوانی علم

ہے۔ جہاں سے مادی حدود کے آگے قدم بڑھا اور احساسات کے آگے انسانیت کی قوت ادراک نے کام کرنا شروع کیا وہاں سے انسانیت کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اس بنا پر وہ کہ جو انسان کو انسان بنانے والا تھا۔ جس نے قرآن کو انسانوں کے لئے نازل کیا تھا۔ اس نے اپنے قرآن میں یہ کہہ دیا ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب۔ اب یہ غیب جسکا اعتقاد ضروری ہے مبدا سے تعلق رکھتا ہے۔ معاد سے تعلق رکھتا ہے۔ وسطی مرتبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب غیبی باتوں کا انکار کیا ،یعنی دنیا نے اپنی ادراک کو احساسات کی زنجیروں میں اسیر کر لیا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کا انکار ہو۔ کیونکہ وہ احساسات کے حدود سے آگے ہے۔ روز آخرت کا انکار ہو جس کا لازمہ یہ ہے کہ جنت و نار کا انکار ہو۔ حیات بعد الموت کا انکار ہو بلکہ اپنی ہستی یعنی روح کا انکار ہو۔ کیونکہ روح کو بھی تو دیکھا نہیں ہے جب آئینہ اٹھایا تو چہرہ نظر آیا، خود نہیں نظر آیا۔ اس لیے کہنے والے نے جو راز داں تھا کہہ دیا کہ:

من عرف نفسه فقد عرف ربه

کیونکہ اگر انسان حیوانات کے حدود میں اسیر ہے تو خود اپنے تئیں بھی نہیں سمجھے گا اور اگر انسانیت کے دائرہ تک قدم پہنچ گیا اور اپنے تئیں سمجھ لیا۔ باوجود کہ اس نے نہیں دیکھا ہے تو اب وہ اپنے خالق کو بھی سمجھ لیگا۔ جب ادراک حیوانیت کی منزل میں ہے تو عمل کو بھی حیوانیت کے حدود میں صرف ہونا چاہئے۔ کیونکہ عمل درحقیقت ادراک کا لازمی نتیجہ ہے وہ اور معنی میں جس کے لحاظ سے ''علم بے عمل'' کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں جب یقین ہے تو اس سے عمل جدا نہیں ہوسکتا۔ اگر عمل الگ ہو جائے تو سمجھئے کہ علم نہیں ہے۔ اور اگر علم حقیقی معنوں میں ہے تو عمل اس سے ہٹ نہیں سکتا۔ اگر ادراک دنیا کے حدود میں منحصر ہو تو عمل کو ان ہی حدود میں محدود ہونا چاہئے ۔ اس لیے انسان کا عمل غیر اختیاری عمل تو ہے نہیں بلکہ ارادی عمل ہے۔ اور ارادی عمل سے اس کے فاعل کا کوئی بھی مقصد ہونا چاہئے۔ اور جب کہ اس دنیا کے آگے کچھ بھی نہیں تو مقصد بھی اسی دنیا میں محدود ہوگا۔ لہذا جس عمل کا نتیجہ اس دنیا میں مل جائے۔ وہ عمل کامیاب اور اگر اس دنیا میں نتیجہ نہ ملا تو عمل ناکام ۔ یہ استبداد ظلم و قہر ہلاکو خانی۔ چنگیزی۔ یزیدی، ان تمام اوصاف کا سرچشمہ ہے اور درحقیقت جبکہ دنیا ہی ہو اور بس، تو میں کہتا ہوں کہ حق بجانب بھی یہی ہے۔ کیونکہ جب اس کے آگے کچھ ہے ہی نہیں اور جو کچھ ہے وہ یہی ہے تو پھر امید پر ایک انسان ملتی ہوئی نعمت کو ہاتھ سے دیدے کس سہارے پر ایک انسان اس دنیا کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنے سے باز رہے۔

ہاتھ میں ایک خنجر ہے سامنے ایک مظلوم کا گلا ہے۔ اور اس کے قتل کے بعد کامیابی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے اور سلطنت وملک یا خزانہ ہاتھ میں آتا ہے تو اب کس سہارے پر انسان اس خنجر کو گلے پر نہ چلائے جب کہ اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ مادیت کی بنیاد پر اگر تہذیب و اخلاق کا نام لیا جائے تو اہل مذہب کی تقلید ہے اور کچھ نہیں ہے۔ چونکہ اہل مذہب نے کہا ہے کہ جھوٹ بولنا قتل کرنا برا ہے یہ باتیں اس طرح مزاج انسانی میں راسخ کر دی ہیں کہ جو شخص مذہب کو نہیں بھی مانتا وہ بھی اپنے ضمیر اور دنیا کے اصول کے مطابق یہ نہیں کہہ سکتا کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے یا قتل کرنا اچھا ہے ۔ ورنہ مادیت کے اصول کو پیش نظر رکھ کر یہ کسی عقلی اصول پر مبنی نہیں ہے کہ انسان اخلاق کو آراستہ کرے اور حقوق کا خیال کرے۔ اصولی حیثیت سے اگر کوئی شخص اس دنیا کو سب کچھ سمجھتا ہے تو اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اس دنیا میں سب کچھ کرے۔ اور کسی کا خیال نہ کرے۔ اگر احساسات کے دائرہ

کے اندر حدود علوم مختصر ہیں تو بیشک عمل انسان کا اتنا ہونا چاہئے کہ مجھے فائدہ حاصل ہو تو یہی در حقیقت حیوانی عمل ہے ۔ حیوانی عمل کیا ہے؟ کھائے پیئے زندہ رہے دوسروں پر تفوق حاصل کرے اور خود زیادہ سے زیادہ اپنے تئیں قوت پہنچائے ۔ یہ معیار تھا حیوانی عمل کا اب انسانیت نے اس کو اپنا شیوہ قرار دے لیا تو ایک انسان کا معیار کامیابی کیا ہوا ۔ دنیا میں آگے بڑھتے جانا، بادشاہ ہو، شہنشاہ ہو، شہنشاہ ہفت اقلیم ہو، مقصد کا آخری نقطہ ہو سکتا ہے ۔ گو تمام دنیا اس کے سرنگوں ہو سکے آگے اس کا مقصد نہیں ہو سکتا ۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ دنیا ہے محدود اور انسانی افراد کی خواہشیں لامحدود ہیں ۔ کیونکہ اب ہر انسان کو اس دنیا میں انتہائی نقطہ تک پہنچنا ہے ۔ اور ہر ایک کا مقصد یہ ہے کہ میں بادشاہ ہفت اقلیم ہوں ، ہفت اقلیم ہیں اتفاق سے سات اور مقصد سب کا ہے یہی ایک ۔ اب سب ناکام ہوں تب بھی اچھا ۔ لیکن کوئی ان میں سے کامیاب ہوگا اور بقیہ تمام افراد ناکامیاب اب دنیا کے افراد کی محرومی اور جذبہ کا مرانی پھر متصادم کیوں نہ ہو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجلس اقوام قائم کی جائے ۔ تخفیف اسلحہ کی تجویزیں پاس کی جائیں ۔ معاہدے کئے جائیں ۔ مگر ہر ایک کے پیش نظر ہے ۔ جنگ اور اگر جنگ نہیں تو اسلحہ کی ایجادیں کس لئے ۔ مثل مشہور ہے کہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے'' اور اگر ماں نہ ہو تو اولاد ہوگی کہاں سے ۔ معلوم ہوا کہ ضرورت اسلحہ کی محسوس ہو رہی ہے ۔ زبان پر ہو صلح اور ایجاد ہوں جنگ کے سامان ۔ تو معلوم ہوا کہ ضرورت جنگ کی بڑھی ۔ اور جتنی زیادہ ایجادیں ہو رہی ہیں اتنا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ ضرورت بڑھ رہی ہے ۔ تو اب میں نہیں سمجھتا کہ تمدن نے ترقی کی کہ تنزل ۔ یعنی تمدن جتنا آگے بڑھ رہا ہے اتنا نقص کو گھٹنا چاہئے، محاسن کو بڑھنا چاہیے، یہاں جتنا تمدن آگے بڑھ رہا ہے تعمیر کے بجائے تخریب کے آلات زیادہ پیدا کئے جا رہے ہیں ۔ ایک زمانہ وہ تھا جب جان لینے کے مواقع کم تھے ۔ کیونکہ اسلحہ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی ۔ اسلحہ کی ایجاد ہوئی تو تلوار کی ۔ بیشک موقعہ جان لینے کا پیدا ہوا ۔ مگر ضرورت تھی جب قاتل مقتول کے پاس پہنچے اس تک رسائی ہو تو اپنا حربہ اور وار کرے اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نقص کا احساس کر کے ایجاد ہوئی ''تیر'' کی ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ذوق انسانی ہمیشہ ترقی خواہ رہا ہے فضا میں ۔ تیر کی ایجاد ہوئی مگر اس کی مسافت محدود اور اثر بھی کم ۔ اگر سینہ پر پڑ گیا تب تو جان لے لی ورنہ بہت سے تیر لگا دیجئے مگر انسان زندہ ۔ اس نقص کو بھی محسوس کیا گیا ۔ بندوق کی ایجاد ہوئی ۔ یعنی اصلاح ہو رہی ہے تخریب میں ترقی اور تکمیل کے ساتھ ۔ گولی ایجاد ہوئی دور سے مار دیا اور ختم کر دیا ۔ اس میں بھی نقص محسوس ہوا کہ صرف ایک گولی سے ایک ہی انسان کو فنا کر سکتے ہیں ۔ اس لیے توپ کی ایجاد ہوئی اور گولے چلائے گئے ۔ اسمیں بہت سے انسان ایک گولے سے فنا کر سکتے ہیں ۔ تمدن ترقی کر رہا ہے ۔ انسانیت زیادہ ہو رہی ہے ۔ توپ میں بھی نقص محسوس ہوا ۔ اس لئے اب ایک اور ایجاد ہوئی جو اب وہ فضا میں پھیلانے والی دوائیاں استعمال ہوئیں وہ گیس ایجاد ہوئی جو غیر معلوم جگہ سے منتشر کر دی گئی تو ہر ذی روح ختم ہو گیا ۔ اور اسے مجرم و غیر مجرم سب کو فنا کر دیا یہاں تک کہ انسانوں کے ساتھ جانور بھی تباہی اور بربادی کا شکار ہو گئے ۔ یہ ہے انسانیت کی ترقی جو اب تک ہوئی ہے اور آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ۔ یہ سب کیا ہوا یہ تمدن میں ترقی ہوئی ــــــــــ ۔ مگر اس طرح دنیا میں انسان کی بقا نہیں ہو سکتی ہے ۔ ترقی کے یہ معنی نہیں تھے کہ انسان آخر میں فنا ہو جائے ۔ جب مشرق اور مغرب میں جنگ ہوگی تو مشرق مغرب کی طرف اور مغرب مشرق کی طرف گیس پھیلائے گا اور دنیا فنا ہو جائے گی یہ سب کچھ نتیجہ کس بات کا

ہے؟ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ جو کچھ ہے یہی دنیا ہے اور اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔ پس اب معلوم ہوا کہ دنیا کا مقصد خود دنیا نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ نظام دنیا نہیں درست ہوگا اس مقابلہ میں معلم اسلامؐ نے جو عالم میں انسانیت کاملہ کا عملی معیار بن کر آیا تھا یہ فرمایا۔

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ

دیکھئے اس فقرہ نے کتنے مفاسد کا سد باب کر دیا۔ اب دنیا کا نظر یہ بدل گیا۔ اب مقاصد حیات انسانی دوسرے ہو گئے۔ اب معیار کامیابی دوسرا ہو گیا۔ سامنے مظلوم کا گلا اور ہاتھ میں برہنہ تلوار اور اس کے قتل پر اس کی تمام ملکیت ہمارے قبضہ میں آئے گی۔ یہ سب کچھ۔ انسان اپنی قوت کو آزماتا ہے۔ مظلوم بیشک بے قابو ہے۔ اسباب بتلاتے ہیں کہ اس کے قتل میں کامیابی بالکل آسان ہے۔ مگر دل کے اندر سے آواز آتی ہے کہ کل کیا ہوگا۔ یہاں تو یہ سب کچھ مگر وہاں اس کا نتیجہ کیا ہے۔ اور پھر یہ فنا ہے اور وہ بقا ہے۔ نظر اس کی دیکھ کر بے بسی سمجھ لیتی ہے۔ ہاتھ تلوار کی باڑھ پر چل کر تیزی کا احساس کر لیتا ہے۔ وجدان اپنے بازوؤں کی طاقت کا پتہ دے دیتا ہے۔ تجربہ اس کے قتل کی صلاح دیتا ہے۔ لیکن کچھ عقل روک رہی ہے۔ خواہشیں کہتی ہیں کہ اس کا خاتمہ کر دو۔ مگر عقل کہتی ہے کہ خبردار ہاتھ نہ اٹھے۔ ورنہ یہ ایک گلا ہے اور تمہاری ہمیشہ کے لیے ہلاکت۔ اب مقصد سب کے دل میں کہ ہم سب کچھ حاصل کر لیں۔ لیکن یہ احساس کہ کسی دوسرے کا حق اپنے پاس نہ آنے پائے۔ کسی دوسرے کے حق پر تعدی نہ ہونے پائے۔ کسی دودرے پر ظلم نہ ہونے پائے۔ یہاں سے انسانی قوت اور جذبات میں اور انسانی خواہشوں کے طوفانی تلاطم میں اعتدالی توازن پیدا ہوتا ہے۔ انسان سب کچھ کرنا چاہتا ہے مگر یہ سمجھ کر کہ اپنا نقصان بھی نہ ہو۔ جس کا نام ہے عاقبت اندیشی، جس کا نام ہے انجام بینی۔ اب عقل کہتی ہے کہ بیشک سب کچھ تمہارا سہی لیکن اس میں کوئی خراب بات نہ ہو۔ اب عقل انسانی کہتی ہے کہ مصلحت بین رہو۔ بیج یہاں بوئیں اور ثمرہ وہاں لیں، کھیتی یہاں کرنا ہے اور درد وہاں کرنا ہے۔ اب یہ سمجھ لیں کہ اس کا ثمرہ وہاں تلخ ملے گا یا شیریں۔ اس کا نتیجہ وہاں کیا ہوگا۔ یہ چیز وہ ہے کہ جو تصادم کو روکتی ہے جو توازن میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔ جو ظالم کے ہاتھ کو مظلوم کے گلے سے ہٹاتی ہے۔ جو زورآور افراد کو کمزور افراد کی کمزوری پر رحم دلاتی ہے۔ وہ ہے یہ چیز اس چیز کے اوپر معیار تمدن مبنی ہے۔ معیار تہذیب سمجھیے۔ سب کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے کہ دنیا کھیتی ہے آخرت کی۔ الیوم المضار وغدا السباق والسبقة الجنة والغاية النّارہ۔ آج تیاری کا دن ہے۔ اور گھوڑ دوڑ ہے وہاں کل اور جیسے دنیا میں انعام ہوتا ہے جو سابق کو دیا جاتا ہے وہاں بھی ویسا ہی انعام مقرر ہے۔ جس کو دنیا میں ''کپ'' کہا جاتا ہے وہ انعام ہے وہاں جنت اور بعض لوگوں کو جنہیں وہاں پہنچنا نہیں ہے ان کے لیے آتش جہنم۔ یہ انعام جو مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر شخص طالب ہے۔ اور جہنم کی منزل آخر جو بعض لوگوں کی ہے وہ بادل ناخواستہ وہاں پہنچیں گے۔ اب انسانوں کے لئے یہ دنیا سب کچھ نہ رہ گئی۔ بلکہ اس دنیا کے آگے ایک چیز اور ہے جس کا نام ہے'' آخرت''، حقیقی کامیابی وہیں کی کامیابی ہے۔ لیکن اس مقام پر دنیا والوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملا کہ اب تو دینا کچھ نہیں رہی جو کچھ ہے وہ آخرت۔ لہٰذا اس دینا کے لئے کچھ کرنا فضول ہے۔ یہاں رہنا کتنے دن ہے۔ واعظین کا بھی انداز بیان الدنیا مزرعة الاخرة کی تفسیر میں یہی رہا کہ بے اعتباری دنیا بیان کی جائے اور ذہن کو اس سے بالکل ہٹایا جائے اور بیشک ضرورت اس کی تھی یہ دیکھتے ہوئے کہ اہل دنیا پورے طور پر

دنیا میں منہمک ہیں اور آخرت کو بھولے ہوئے ہیں لہٰذا اہل آخرت کو پورے طور پر کوشش کرنا پڑی تاکہ ان میں سابقہ عادات جو پہلے سے قائم ہیں ان سے پوری نفرت دلائی جائے تاکہ اس سے کچھ نہ کچھ آخرت کا احساس پیدا ہو اور ان کا طرز عمل حد اعتدال پر آجائے لیکن مجھے اس حدیث کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ کیا واقعی آپ دنیا کو برباد ہو جانا چاہئے۔یعنی دنیوی زندگی کے اسباب مہیا کرنے بیکار ہیں؟ کیا یہ بتلا دیا گیا ہے کہ محراب عبادت میں زندگی گزار دو۔اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلو۔اب نہ شادی کرنے کی ضرورت ہے نہ اسباب معاش مہیا کرنے کی کیونکہ دنیا کی کامیابی کوئی چیز نہیں ہے۔ تخیل بیشک ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مذہب کی تعلیمات پر منحصر ہے جس نے آخرت کی کامیابی کا معیار مقرر کیا۔

اس نے بیشک کہا کہ:

''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''

یعنی دنیا کا مقصد آخرت کو قرار دیا۔لیکن آخرت میں کامیابی کا ذریعہ اس نے کیا بتلایا؟ اگر اس نے آخرت کی کامیابی کا معیار یہ بتلایا ہو کہ دنیا سے کنارہ کشی اس عالم کی کامیابی کا سبب ہے اور اس صورت میں دنیا مزرعۃ الآخرۃ۔'' کا مفاد قرار پائے گی اگر اس نے کہا کہ ملکوت آسمان میں وہ داخل نہیں ہوسکتا کہ جس نے شادی کی ہو۔اگر اس کہنے والے کی طرح تعلیم دی ہے تو بیشک اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْآخِرَۃِ۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان ایک وقت کھالے اور دوسرے وقت کی فکر نہ کرے۔لیکن اگر کہنے والے نے عام اعلان کر دیا ہے کہ'' اسلام تعلقات دنیا کو چھوڑ دینے کا حامی نہیں ہے تو اب ''الدنیا مزرعۃ الآخرۃ'' کہنا یہ بتلاتا ہے کہ دنیا کو بالکل برباد کیا ہے تو آخرت بھی برباد۔اگر اس نے بجائے یہ کہنے کے کہ ملکوت آسمان میں وہ داخل نہیں ہوگا جس نے شادی کی ہے ،یہ کہا ہے کہ تنا کحوا و تناسلوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیامۃ۔ظاہر ہے کہ مردم شماری کا فائدہ دنیا میں ہے نہ کہ آخرت میں۔لیکن وہ رسولؐ ہم کو دنیا میں مردم شماری کی ترغیب دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم جہاں تک دنیا میں بڑھو گے تمہاری کثرت دنیا میں ہوگی تو میں اس کے اوپر ناز کروں گا تو اب آخرت کی کامیابی کا وہ معیار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کہ اب ہم تعلقات دینا کو قائم کرنے کے ساتھ اگر فرائض کا خیال رکھیں گے، لذتوں کو اس حد تک حاصل کریں گے جس حد تک اجازت دی گئی ہے تو اس وجہ سے آخرت کی کھیتی برباد نہ ہوگی بلکہ آباد ہوگی میں سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے یہ میرا موضوع قرار دیا تھا ان حضرات کے دل میں یہی مقصد تھا جو میں نے اب شروع کیا ہے۔مگر واقعی میرے موضوع کے لازمی اجزا وہ تھے جنہیں میں نے اب تک بیان کیا ہے۔اور یہ مختصراً اس کا نتیجہ ہے جسے میں اب بیان کر رہا ہوں۔ تو اب دنیا کو بالکل چھوڑ دینا دنیا سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لینا یہ درحقیقت آخرت کی آبادی کا باعث ہے۔اور اس دنیا کو کسی حد تک حاصل کرنا آخرت کے ساتھ ایک حد تک ضروری ہے۔مجھے قرآن مجید میں آیت نظر آتی ہے جس میں اہل دنیا اور اہل آخرت کا تقابل کیا گیا ہے۔گذشتہ سال میں نے اس کو عنوان کلام قرار دیا تھا۔ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔

بہت لوگ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں یعنی اپنے طرز عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمیں ملنا ہے وہ یہیں مل جائے۔لیکن

آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہے یہ اہل دنیا ہیں ۔ اب ان کے مخالف جو دوسرا فریق ہے اس کا تذکرہ ہے ۔ ایک فریق وہ تھا جو کہتا ہے جو کچھ ہمیں دینا ہے دنیا میں دیدے ۔ اس کے مقابل کی جماعت یہ کہتی ہے جو کچھ ہمیں دینا ہے آخرت میں دے ۔ بیشک وہ اہل دنیا قرار پاتے ہیں اور یہ اہل آخرت ۔لیکن قرآن اس گروہ کے مقابل فریق کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں ایک خیر و برکت حاصل ہو اور آخرت میں ایک خیر و برکت ۔ ظاہر میں یہ سموئی ہوئی صورت ناقص درجہ رکھتی ہے ۔ اہل آخرت ان لوگوں کو نہیں کہنا چاہئے ۔ وہ کہ جو مکمل اخلاق کا معلم ہو اسے مقام مدح میں پیش کرنا چاہئے ۔ وہ جو معیار کمال ہو ۔ اہل دنیا وہ تھے جو سب کچھ دنیا میں چاہتے تھے ۔ ان کے مقابلہ میں اہل آخرت انہیں ہونا چاہئے کہ وہ جو کچھ چاہیں بس آخرت میں چاہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ خداوند عالم ہم کو ایک نیکی دنیا میں عطا کر اور ایک نیکی آخرت میں عطا کر یہی وہ لوگ ہیں جو بہرہ اندوز ہوں گے اس سعی سے جو انہوں نے کی ہے تو اب معیار کامیابی کیا ہو گیا یہی کہ دنیا برباد ہو نہ آخرت ویران ہو ۔ دنیا کی بھی آبادی ہو اور آخرت کی بھی یہ وہ چیز ہے جو انسان کے مقاصد حیات میں اعتدال پیدا کرتی ہے میں سچ کہتا ہوں کہ یہ آخرت کی آبادی کا احساس بھی دنیا کی آبادی کے لیے ہے کیونکہ وہ جسے صرف دنیا پیش نظر ہوتی ہے صرف دنیا کے خیال سے ایک کام کرتا ہے وہ صرف انفرادی دنیا کی آبادی کا ذریعہ ہے ۔ لیکن اجتماعی بربادی کا باعث ہے ۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ انفرادی ترقی کرے ۔لیکن انسان کی شخصی کامیابی نوعی کامیابی کے تحت میں ہونا چاہئے ۔ انفرادی ترقی تو انسان کی دنیا کو پیش نظر رکھ کر ہو جاتی ہے مگر اجتماعی مفاد انسان کے لیے آخرت کو پیش نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔ اس لیے جب انسان نے دنیا ہی کو سامنے رکھا تو میں نے کہا کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے سب کچھ حاصل کرے اور غیر کا خیال نہ کرے اور جب غیر کا خیال پیش نظر نہ ہوا تو حقوق میں تصادم ہو گا ۔ جس وقت یہ قوانین آپس میں ٹکرائیں گے پاش پاش ہو جائیں گے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی کامیابی کی طلب پیش خیمہ قرار پائی اجتماعی فنا کا اور جب ہیئت اجتماعی فنا ہوئی تو شخص کہاں باقی رہے گا ۔ اس لئے اسلام نے دوسرے کے حقوق کے تحفظ کے لئے آخرت کا خیال پیدا کیا ۔ اور جب دوسروں کے حقوق کا تحفظ ہو گا تو اجتماعی تصادم نہ پیدا ہو گا اور جب اجتماعی تصادم نہ ہو گا ۔ تو نوعی بقا رہے گی ۔ اور فرد بھی پھولے پھلے گی ۔ اس لیے یہ سب کچھ انسان کے لئے آخرت اور دنیا کو سدھارنے کے لئے کیا ہے ۔ ورنہ خدا کے لیے ضرورت نہ تھی کہ اپنے تئیں منوائے ۔ اس نے اپنے تئیں منوایا اس لئے جب مجھے مانو گے تو میری رضا حاصل کرنے کے لئے نیک کام کرو گے ۔ اور آخرت کو منوایا اس لئے کہ جب آخرت کو مانو گے تو وہ باتیں اختیار کرو گے جو آخرت کی کامیابی کا باعث ہیں ۔ اس لئے تم ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹو گے ۔ ایک دوسرے کے مال کو ناحق غصب نہ کرو گے ۔ دوسروں کے حقوق پر بیجا تصرف نہ کرو گے ۔ اور اس لئے حقوق خداوندی سے زیادہ حقوق انسانی کو اہم قرار دیا ۔ یعنی کہا کہ نماز پڑھو تو شاید میں معاف کر دوں مگر یاد رکھو کہ اگر کسی غیر کا ایک پیسہ تمہارے قبضہ میں آ گیا تو مجھے حق نہیں ہے معاف کرنے کا جب تک وہ معاف نہ کرے ۔ حقوق اللہ میں خدا سے سابقہ ہے اور حقوق الناس میں ایسے ایسے انسانوں سے سابقہ پڑا ہے جن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ میرے ساتھ اگر کسی نے برائی کی ہے تو میں اس کا بدلہ لے لوں ۔ خدا کا گناہ کیا اور پھر توبہ کر لی تو وہ کبھی منھ پر بات بھی نہیں لاتا لیکن انسانوں میں

سے اگر تم نے کسی ایک کی خطا کی اور اس نے تمہیں معاف بھی کر دیا تو وہ معاف کرنا ہزاروں سزاؤں سے بڑھ کر ہو جائے گا۔ یہ انسانوں کے حقوق ہیں۔ جن اعتقادات کو اسلام نے دنیا کے اندر تعلیم کی حیثیت سے پیش کیا سب کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی عملی اصلاح ہو۔ خدا کی توحید کا اقرار وہی ہے جس سے انسان میں ایک طرف اپنی انسانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں وہ ہوں کہ مخلوق الٰہی میں کوئی شئے اس قابل نہیں ہے کہ جس کے سامنے سر تسلیم خم کروں انسان کی پست نگاہ تھی کہ پتھر کے سامنے جھکا اب اس کی قوت نظر کی ترقی فضا میں پرواز کیا کر سکتی ہے۔ جب اس نے اپنے کو دنیا کے آگے حقیر بنا لیا اور جمادات کے آگے سر نیاز خم کر دیا تو اب اس کو کیا حق ہے کہ دنیا میں ترقی اور سربلندی کا نام بھی لے۔ لیکن اسلام کی تعلیم میں خدائے برتر نے انسان کو اب تمام چیزوں سے اپنی طرف موڑا ہے۔ اور کہا کہ تم کو ان تمام چیزوں سے سربلند ہونے کی کوشش کرنا چاہئے اسی طرح اسلام نے جو آخرت کی کامیابی کا عقیدہ قائم کیا ہے اس کے تحت میں اگر انسان اس دنیا میں چاہتا ہے کہ آخرت کو حاصل کرے تو یہ بات نہیں ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا چاہئے۔ اس دینا سے کنارہ کشی کرنا چاہئے۔ محراب عبادت میں شب و روز خدا کی بندگی میں مصروف ہو۔ ہر وقت نماز پڑھا کرے۔ روزے رکھا کرے۔ نہیں ایسا نہیں۔ یہ معیار کامیابی نہیں ہوا۔ بلکہ یہ ہے انسان علائق دنیا کو اختیار کرتے ہوئے، لذائذ دنیا کو حاصل کرتے ہوئے یہ خیال پیش نظر رکھے کہ ان منافع سے مجھے کس حد تک منتفع ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر اس نے ان حدود کے اندر جو مقرر کر دیئے گئے ہیں قدم رکھا تو آخرت یقینا کامیاب۔ اگر اپنی حد سے کنارہ کشی کی یعنی بس اپنے مطلب سے کام رکھا اور اس کے آگے کسی حد اور حق کا لحاظ نہ رکھا تو یقینا اس نے آخرت کی بربادی کی۔ علی گڈھ کالج سے ایک مرتبہ سوال بھیجا گیا تھا، اسمیں دریافت کیا گیا تھا کہ اسلام میں صحیح اسپرٹ کیا پیدا کرنا چاہئے۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے لکھا ہوگا کہ اسلام کی اسپرٹ یہ ہے کہ جنگ خوب کرو۔ کچھ نے لکھا ہوگا کہ اسلام کی اسپرٹ یہ ہے کہ دنیا میں ہر ایک پر سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

لیکن میں نے جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا کہ

''اسلام کا مقصد دنیا میں اور اسلام نے جو اسپرٹ پیدا کرنا چاہی تھی وہ یہ تھی کہ انسان کو خدا کا فرض شناس بندہ بنایا جائے۔''

یہ وہ چیز ہے کہ قرآن میں ابتدا سے لیکر انتہا تک اس کو ملحوظ رکھا گیا۔ ایمان یعنی اعتقاد مبداء معاد اور احساس عمل۔ حقوق اللہ و حقوق الناس اب کون سا شعبہ دنیا کا ہے جو اس میں نہیں ہوگا۔ اب انسان اگر یہ چاہے کہ وہ آخرت کی بلندی اس میں سمجھ لے کہ ہر وقت خدا کی تسبیح کرتا رہے۔ اور محراب عبادت میں کھڑے ہو کر سجدہ کرتا رہے۔ لیکن اس دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ آپس کے میل ملت سے آپس کے تعلقات معاشرت اور روابط اجتماعی سے کوئی مطلب وغرض نہ ہو تو کیا وہ خدا کا فرض شناس بندہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت میں ہیئت اجتماعی کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ انسانی آبادی اس وقت میں انفرادی اشخاص پر مشتمل ہو گی۔ جن میں باہمی کوئی ارتباط نہ ہو۔ کیوں کہ ہر ایک خدا سے باتیں کر رہا ہے اس سے لو لگائے ہوئے ہے۔ لیکن وہ رشتے جو آپس میں باہمی ارتباط قائم کریں۔ وہ اس طرح کی عبادت سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ عبادت کا بالکل غلط تخیّل ہے جو بہت سے افراد کے ذہن میں غلط طور سے راسخ ہو گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسلام نے ان رشتوں میں بھی جو اس کے ساتھ ہیں انسان کے اجتماعی مفاد کو

مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے یعنی عبادت میں نماز سے زیادہ کون چیز ہوگی کہ جو خدا سے رشتہ رکھتی ہو۔ یعنی خدا کی بارگاہ میں حضوری یہ چیز وہ ہے کہ کہا گیا کہ اگر یہ قبول ہوئی تو سب کچھ قبول اور اگر یہ مسترد ہوئی تو سب کچھ مسترد۔ اس نماز کے بارے میں یہ کہا گیا کہ یہ دین کا ستون ہے تو اس سے زیادہ بڑھکر کون چیز ہے کہ جو بندے کو خدا کے ساتھ مربوط کرے لیکن اس ربط کو جو اپنے ساتھ تھا زیادہ پسندیدہ اس وقت قرار دیا جب کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں باہمی ارتباط کا مظاہرہ کریں۔ اس طرح نماز جماعت کا حکم دیا۔ یعنی اگر خضوع وخشوع کے معیار پر نظر ڈالئے اگر رجوع قلب کے نقطہ نظر سے دیکھئے تو گھر کا دروازہ بند کر کے سوتوں کی نظر بچا کر پردہ ڈال کر خدا کی یاد کرنا انسان کے لئے زیادہ رجوع قلب کا باعث ہوسکتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اجتماعی ہو اس میں انسان کا ذہن بھٹکتا ہے۔ چاہئے کہ اس قسم کی نماز خدا کی بارگاہ میں پست ہوجائے مگر یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ سنو! گھر کی نماز سے افضل ہے مسجد میں جا کے نماز پڑھنا۔ اس کے بعد مسجد محلہ سے زیادہ افضل ہے وہ مسجد جہاں تمام شہر کے لوگوں کا اجتماع ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے سے تمہارے رشتہ کو زیادہ اس وقت وابستہ کروں گا جب تم دوسرے لوگوں کے ساتھ مربوط ہو کر میرے پاس آؤ۔ خالص اپنے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملے اور اس میں دوسروں کا خیال پوچھیے لوگوں سے جو کہتے ہیں کہ دوسرے کا احساس پیدا ہونا نماز میں رجوع قلب کے منافی ہے۔ امام کے لیے کیوں بہتر ہے کہ آواز اپنی ماموین کو سنائے۔ پھر ماموین کا خیال امام کے ذہن میں پیدا ہوا یا نہیں۔ ماموین کا انتظار رکوع میں شرکت کے لئے اس کے ساتھ اذان مقرر کی گئی، اعانت باہمی کی تعلیم آخرت کی باتوں میں لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ اگر تم ہماری بارگاہ میں آنا چاہتے ہو تو دوسرے بے خبر لوگوں کو باخبر کرتے ہوئے آؤ۔ بلند آواز سے بلندی پر جا کر اذان کہو تا کہ دور دور آواز جا سکے۔ اور وہ تمہاری آواز سن کر آسکیں اس کے بعد بہا نے ہیں کہ لوگ آئیں گے تو کوئی وضو کر رہا ہے کوئی تیار ہو رہا ہے۔ اس لئے اقامت کہو اس کے بعد امام کو ہدایت دی وہ ماموین کا خیال کرے۔ اس لئے کہ امام جماعت کو ہدایت کی گئی ہے کہ نماز میں زیادہ طول نہ دو۔

امیر المومنین علیہ السلام کی وصیت جس میں آئین جہاں بانی ہیں۔ جس میں فوج کے متعلق ہدایات ہیں۔ زراعت پیشہ افراد کے متعلق ہدایات ہیں جو اس وقت ہر ایک کے لئے لائحہ عمل ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں کہ جب تم لوگوں کو نماز پڑھاؤ تو ہرگز ایسا نہ ہو کہ ان کے اوپر گراں گزرو۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ نماز گزاروں میں ضعیف العمر لوگ ہوں گے ایسے لوگ ہوں گے جن کو ضرورتیں درپیش ہیں۔ وہ اپنی ضروریات چھوڑ کر اور یہ خیال دل میں قائم کر کے کہ چلو نماز با جماعت کا ثواب حاصل کریں۔ جب انہوں نے ضرورت کو ملتوی کیا تو گویا خدا کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ نماز میں تخفیف کی جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ نماز میں طول دیا جائے۔ تب کہیں جا کے نماز میں کمال پیدا ہوگا۔ لہٰذا اسلام جو درحقیقت روح پر نظر ڈالتا ہے۔ حقیقت عمل کو دیکھتا ہے وہ ان عارضی باتوں پر نظر نہیں ڈالتا۔ اسلئے یہ ہدایت ہوئی کہ نماز مختصر پڑھی جائے۔

اب امام کے دل میں نماز کے اندر ماموین کا خیال پیدا کیا گیا جب صرف اپنے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز اس میں انسان کے باہمی روابط کو اس طرح پیش نظر رکھا تو اس کے بعد کون سی چیز وہ ہے کہ جس میں اس چیز کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ روزہ مگر اس کے ساتھ افطار کا ثواب جو کسی مومن کا روزہ افطار کرا دیا تو اس نے گویا ایک بندہ راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ ماہ

صیام کے روزے تیس دن کے اگر آپ نے رکھے اور اس کے بعد آپ نے فطرہ نہ دیا تو گویا آپ نے مکمل روزے نہیں رکھے۔ آپ کو خیال رکھنا چاہئے کہ آخرت کی کامیابی یہی ہوگی کہ انسان دنیا کو ہاتھ سے نہ دے۔ اگر دنیا کو ہاتھ سے دیدیا تو اسلام کو نقصان ہوا۔ بیشک ہر چیز میں فرائض کا احساس رکھا گیا ۔ ہر چیز میں حقوق کو پیش نظر کیا گیا۔ اس لئے درحقیقت معیار ناکامی یہ بات قرار پائی کہ من یتعدد حدود الله فاولئك هم الظالمون ۔ جو لوگ خدا کے مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھتے ہیں وہ ظالم ہیں تو اب عادل کون ہے؟ وہ ہے کہ جو مقرر کیے ہوئے حدود پر قائم رہے۔ تصادم ہمیشہ ہوتا ہے۔ احکام کے خلاف آگے بڑھنے سے۔ اور جب اپنے حد میں رہے گا تو تصادم نہ ہوگا زکوٰۃ اور خمس یہ تمام باتیں خالص خدا کے احکام ہیں۔ جو حقوق الناس سے متعلق ہیں۔ یعنی اس میں خدا کی طرف سے رشتہ اتنا خفی ہے کہ اس کی حیثیت گم ہوگئی ہو یعنی ظاہر میں زکوٰۃ نماز کی طرح خدا کی عبادت نہیں معلوم ہوتی وہ آدمیوں سے متعلق ہے راہ راست خدا سے متعلق نہیں ہے۔ لیکن آپ دیکھئے گا کہ وہ نماز کے پہلو بہ پہلو عبادات میں مندرج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت میں باطنی روابط سے علیحدہ نہیں ہے دنیا کی مذمت کی گئی تھی لیکن دنیا والوں نے اس کو غلط طریقہ سے سمجھا۔ دنیا کی مذمت ان معنوں سے کی گئی ہے کہ وہ دنیا جو آخرت کے مقابلہ میں اختیار کی جائے۔ لیکن جو دنیا آخرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کی جائے۔ وہ درحقیقت آخرت کے مقابل کوئی چیز نہیں تا کہ اس کی مذمت کی جاسکے۔ سعی مقصد کا پیش خیمہ ہے۔ وہ اس سے الگ کب ہے راستہ منزل سے جدا ایک ہے زراعت درحقیقت ثمرہ سے الگ کر کے دیکھی کب جاسکتی ہے۔ کھیتی کا اچھا ہونا یا برا ہونا ثمرہ کے لحاظ سے ہے۔ اس لئے دنیا کو الگ کر کے آخرت سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ اس بنا پر وہ جو کہ حقیقی معنوں میں تعلیم اسلام کے معلم تھے۔ انہوں نے اس غلط تخیل کی رد کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان ترک دینا کرے۔ بلکہ اس کے معنی ہیں وہ دنیا کہ جس میں آخرت کا خیال نہ رکھا جائے۔ ضرورت ہے ایسے مقام پر کہ آپ کے سامنے ان تعلیمات کو ان کے اصلی خط و خال کے ساتھ پیش کیا جائے جو آپ کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے پیش کئے گئے تھے۔

سب سے آخری خطبہ جو رسول اللہؐ نے اپنے اصحاب میں فرمایا۔ اس میں آپ نے فرمایا ہے کہ

من عرضت له دنیا و آخرة فاختار الدنیا و ترك الآ خرة لقی الله و لیسئله حسنة یتقی بها النّار و من اخذ الآخرة و ترك الدنیا لقی الله یوم القیامة و هو عنه راض۔

جس شخص کے پیش نظر دنیا و آخرت ہو، سامنے ایسا مسئلہ ہو جس میں دنیا و آخرت میں ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟: اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی خاص احکام پر دنیا اور آخرت کے مفاد میں تصادم ہے یعنی دنیا ملتی ہے ان ذرائع سے جن کے باعث آخرت ہاتھ سے جاتی ہے۔

اس موقعہ پر ارشاد ہوا ہے کہ اگر دنیا کو اختیار کرے گا اور آخرت کو چھوڑ دے گا تو پھر خدا کے یہاں اس کے لئے کوئی اچھائی نہ ہوگی کیونکہ اگر دنیا سب کچھ ہوتی تو ہم دنیوی مفاد کو مقدم کر لیتے لیکن جب دنیا پیش خیمہ ہے آخرت کا اور آخرت کی منزل بھی آگے تھی تو اب دنیا کے مفاد کو آخرت چھوڑ کر نہیں اختیار کیا جاسکتا۔ دنیا کو اختیار کرنا اور آخرت کا خیال نہ رکھنا یہی چیز وہ ہے کہ جس کے لیے کہا گیا ہے۔

رأس كلّ خطيته حب الدّنيا

یعنی آدمی دنیا کو سب کچھ سمجھ لے اور دنیا ہی کو اپنے پیش نظر رکھ لے تو یہ خطا کارنامہ ہے اور یہ درحقیقت متن یا خلاصہ ہے۔ میری اس شرح یا تفصیل کا جس کو میں نے ابتدائی منزل میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر ہم آخرت کے خیال کو ذہن سے نکال ڈالیں تو کسی جرم سے ہمیں روکنے والا کوئی نہیں ہے۔۔ اور تمام جرموں کا سرچشمہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا کو سب کچھ سمجھ لے۔ اب اس کے ساتھ اس غلط فہمی کی گنجائش ہے کہ دنیا کا خیال انسان کو بالکل نہ رکھنا چاہئے۔ اس کو امیر المومنین علیہ السلام سے کہ جن سے بڑھ کر زاہد اسلام میں کوئی نہیں ہوا۔ اور نہ دنیا میں ان کی ایسی مثال کوئی پیش کر سکتا ہے۔ زہد و تقویٰ میں جو معیار انہوں نے پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

آپ سے زہد فی الدنیا کے متعلق

ویحك حرامها فتیکه

سوال ہوا۔ فرمایا کہ بظاہر سوال کرنے والے کا خیال یہ تھا کہ دنیا کو حاصل کرنا زہد کے خلاف ہے۔ اس لئے آپ نے کلمہ کے ساتھ فرمایا: وائے ہو تجھ پر مطلب یہ ہے کہ ''حرام دنیا سے روگردانی کرو۔'' یہ امیر المومنین علیہ السلام کا کلام ہے جنہوں نے عبادت کے ہر شعبہ کو کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ اس لئے کہ عبادت کے شعبے الگ الگ ہیں۔ مجھے یہ حق نہیں کہ میں ائمہ میں سے کسی کے متعلق کچھ کہہ سکوں کہ وہ عبادت میں کسی سے پیچھے تھے۔ کیونکہ ہر ایک نے اپنے زمانے میں اپنے فرائض کے اعتبار سے وہ عبادت کی جو اس وقت امکانی حدود میں ممکن تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عبادت جو نماز روزہ کی حیثیت سے عبادت سمجھی جاسکتی تھی اس میں امیر المومنینؑ کے بعد سب سے پہلا درجہ سید سجاد امام زین العابدینؑ کا تھا لیکن یہ امیر المومنین علیہ السلام کا کمال نفس ہے جس کے مظاہرہ کا آپ کو موقع ملا کہ ہر شعبہ عبادت کو آپ نے حد کمال تک دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس شعبہ میں بھی جو نماز و روزہ سے متعلق ہے۔ آپ کی وہ ہستی تھی کہ امام زین العابدینؑ کے سامنے ایک روز محمد باقر علیہ السلام نے کہا کہ آپ کی عبادت کی تو انتہا ہوگئی، کہاں تک عبادت کیجئے گا تو آپ نے فرمایا کہ ذرا وہ صحیفہ لے آؤ جس میں امیر المومنین علیہ السلام کی عبادت کا تذکرہ ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے وہ صحیفہ پیش کیا، آپ نے دیکھا تو فرمایا کہ کون امیر المومنین علیہ السلام کی سی عبادت کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ دوسرے شعبے عبادت کے یہاں تک کہ جب آپ سلطنت اسلام کے مالک تھے، جس میں سوائے شام و مصر کے چند علاقوں کے تمام عالم اسلامی آپ کے لئے سرنگوں تھا۔ اس میں آپ نے حقوق اللہ اور حقوق الناس کو دنیا و آخرت کے باہمی ارتباط کے اجتماع کو اس طرح سے دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی نظیر نہ پہلے ہوئی تھی نہ اس کے بعد۔ حقوق الناس کا اتنا خیال کہ بازار تشریف لے جاتے ہیں اور قنبر کو ہمراہ لیتے ہیں، دو پیراہن خرید فرماتے ہیں۔ ایک سات درہم کا دوسرا پانچ درہم کا پانچ درہم کا خود اپنے واسطے اور سات درہم والا قنبر کو عطا کیا قنبر نے جب اس بات کو محسوس کیا کہ سات درہم والا تو مجھکو عطا کیا اور پانچ درہم والا اپنے واسطے تو عرض کیا کہ مولانا یہ آپ زیب جسم فرمائیے۔ اس کا جواب مولا کو ایسا نہیں دینا چاہے جس سے قنبر کو یہ احساس بھی پیدا ہو کہ میں کم درجہ کا ہوں، اس لئے مساوات قائم کرنے کے لیے آپ نے مجھے زیادہ قیمت والا دیا ہے۔ یہ درحقیقت اپنی اصلاحی ادعائے بلندی کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اس لئے یہ نہیں کہا کہ میں تمھیں زیادہ قیمت کا دیتا ہوں کہ تمہاری غلامی کے معیار کو بلند کروں۔ بلکہ وہ جواب دیا جو حقیقی روح مساوات کے دل نشین ہونے کی صورت میں ایک انسان کہہ سکتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے

اپنے بچوں سے کہا جاتا ہے۔فرمایا کہ ''نہیں قنبر تم کمسن ہو تمہارے لیے وہی موزوں ہے، میری عمر گزر چکی ہے میں یہی پہنوں گا۔'' یعنی جواب میں جھلک نہیں آنے دی ایسے پہلو کی جس سے تفریق ظاہر ہوتی ہو۔

بہرحال اب ملاحظہ ہو کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے معیار زہد و تقویٰ کیا قرار دیا ہے۔

علاء بن زیاد حارثی نے آپ سے آکر عرض کیا کہ میرے بھائی عاصم نے بالوں کے کپڑے پہن لئے ہیں اور دنیا سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ کہا کہ بلاؤ اس کو میں سمجھاؤں۔ اس کو بلایا گیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ تم نے شیطان کا بتایا ہوا راستہ کیوں اختیار کرلیا ہے؟ تمھیں اپنے اہل و عیال پر رحم کرنا چاہیئے۔ اس شخص کو یہاں پر گرفت کا موقع ملا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ جو ایسے کپڑے پہنتے ہیں اور ایسی غذا نوش فرماتے ہیں۔ یہ موقع سکوت کا نہیں تھا آپ نے فرمایا کہ میں ہوں حاکم اور حاکم کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے۔ اگر میں اچھے کپڑے پہنوں گا تو جو غریب ہیں اور ان کے پاس پہننے کو نہیں ان کی دل شکنی ہوگی۔ اس لیے میں ایسے کپڑے پہنتا ہوں۔ اور حاکم ہونے کی حیثیت سے میرے اوپر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن ہر شخص پر یہ اور پابندی نہیں عائد کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں جن کے متعلق میں نے کہا کہ آپ سے بڑھکر امیرالمومنینؑ کے بعد عبادت کسی نے دنیا کے سامنے نہیں پیش کی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ الدنیا دنیا۔ ان دنیا بلاغ و دنیا ملعونۃ۔ دنیائیں دو ہیں ایک دنیا ضروریات کی پورا کرنے والی اور ایک دنیا قابل لعنت۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دنیا جو ضرورت کو پورا کر نیوالی ہے اور منزل تک پہونچانے والی۔ وہ دنیا قابل اختیار کرنے کے ہے۔ قابل نفرت نہیں ہے۔ دوسری دنیا وہ ہے جو منافی آخرت ہے وہ وہ ہے جو منزل تک پہنچنے والی نہیں ہے بلکہ منزل سے دور کرنے والی ہے۔

پھر ایک حدیث میں ہے کہ زہد کے معنی ہیں حرام سے بچنا۔ ایک حدیث میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں

الزهد فی الدنیا قصر الا صل و شکر کل نعمة والورع عما حرم الله علیك۔

زہد یہ ہے کہ میں توقعات کرتا ہوں اور خدا کی ہر نعمت کا شکر ادا کرتا ہوں اور جو باتیں خدا نے حرام قرار دی ہیں ان سے پرہیز ہو۔ یہ ہے زہد۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

لیس الزهد فی الدنیا باضاعة المال ولا تحریم الحلال بل الزهد فی الدنیا ان لا تکون بما فی یدك او تو منك بما فی ید الله عزوجل۔

یعنی زہد یہ نہیں ہے کہ مال کو ضایع کرو اور نہ یہ ہے کہ حلال چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام کولو۔ بلکہ دنیا کا زہد یہ ہیکہ تم دنیا کی موجودہ لذتوں پر بھروسہ آخرت کی نعمتوں سے زیادہ نہ رکھتے ہو۔ جیسے عمر سعد نے اپنے شعر میں کہا تھا۔ وما عاقل باع الوجو بدیں،'' مطلب یہ تھا کہ ملک رے نقد ہے اور آخرت قرض۔ کون عقلمند ہوگا جو نقد کو قرض کے مقابلہ میں ہاتھ سے دے۔ مادی نقطہ نظر سے بالکل ٹھیک ہے وقتی کامیابی اور وہاں کا خیال موہوم کون عاقل ہوگا جو اس کو اختیار کرے۔ اگر حاضر پر غائب سے زیادہ بھروسہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عملی حیثیت سے کوئی بے گناہ قتل بھی ہو مگر ملک دنیا مل جائے۔ کیونکہ بے گناہ کے قتل نہ کرنے میں یہاں کچھ نہ ملے گا۔ اور قتل کرنے میں یہ دنیا موجود ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ زہد کا معیار یہ ہے کہ دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں قابل اعتماد نہ سمجھو کو بلکہ آخرت کو دنیا ہی کے

ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اس کے بعد اور سنئے اور امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

سلامت الدّین وصحت البدن خیر من المال و المال زینة من زینة الدنیا حسنة۔

یعنی دین کی سلامتی اور جسمانی صحت مال سے بہتر ہے۔ یہ موازنہ ہے جو کیا جا رہا ہے مطلب یہ کہ جان کا صدقہ مال ہے۔اور دین وہ چیز ہے جس کے لئے جان بھی دیدینا جائز ہے۔ سلامتی دین اور صحت جسمانی ۔ ظاہر ہے کہ صحت جسمانی بھی دنیا کی چیز ہے۔ وہاں بھی آخرت کے ساتھ دنیا کی چیز کو شریک کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مال سے بہتر ہیں اور مال بھی دیا کی نعمتوں میں سے ایک اچھی نعمت ہے ۔ اب یہ نہ کہئے گا کہ مال کچھ نہیں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے وصیت کی ہے اپنے اصحاب کو

اذا حضرت بلية فاجعلوا اموا لكم دون انفسكم و اذا انزلت فاوله فاجعلو انفسكم دون دينكم۔

جب کوئی بلا آئے تو اپنے مال کو اپنے نفس کا صدقہ قرار دو۔یعنی جان کو مال پر مقدم کرنا۔اور جب کوئی مصیبت آئے جس میں تمہارے دین کا سوال ہوتو جان کو اپنے دین پر نثار کردو۔

جس طرح نفس انسانی بجائے خود قابل حفاظت ہے لیکن مذہب پر آفت آنے کی صورت میں رائیگاں کر دیا جاتا ہے اسی طرح مال بھی بجائے خود حفاظت کا مستحق ہے۔لیکن وہ جان کی حفاظت کا ذریعہ بنتا ہے۔جان کی جب حفاظت کی جاتی ہے وہ بھی درحقیقت مفاد دین ہی کے لیے ہوتی ہے۔تقیہ میں یہی اثر/ راز مضمر ہے۔

درحقیقت ہم نے تو اس مسلک کو بھلا دیا جس کی ہم کو تعلیم دی گئی تھی اور اگر ہم اس مسلک کو پیش نظر رکھتے جو ہم کو بتلایا گیا تھا تو میں سچ کہتا ہوں کہ ترقی میں آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں ہم تین سے بارہ ہوئے۔سلمانؑ۔مقدادؓ۔ابوذرؓ۔ شروع میں یہی تو تھے پھر بارہ ہوئے۔اور بارہ سے ایک وقت میں ۷۲ ایسے ہوئے جن کی نظیر عالم میں نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی قوم اپنی سچی ترقی کا ثبوت اتنی محدود مدت میں اتنا نہیں دکھلا سکی جتنا شیعوں نے دکھلایا۔ اتنے قلیل عرصہ میں کسی مذہب نے ترقی کر کے سچا نمونہ اس طرح دنیا میں نہیں پیش کیا۔

کیا دنیا سیاست ائمہ علیہ السلام پر اعتراض کرے گی۔ اس سے بڑھ کر دینا میں سیاست ہوسکتی ہے کہ ہزاروں پر دوں کے اندر رہ کر ہزاروں پابندیوں کے باوجود دہنوں میں قفل کے ساتھ ۔ زبانوں میں گرہ ہونیکے ساتھ، سروں پر تلواروں کے ساتھ اس طرح سے مشکلات اور دقتوں کے ساتھ پھر بھی اس طرح اپنے مفاد کی تبلیغ کر سکیں اور اس طرح اپنے مشن کو قوی بنا سکیں ۔ کہ ایک پائدار وجود کے ساتھ دنیا میں ہمیشہ کیلئے قائم ہوجائے۔

اس کے بعد آپ دیکھئے ائمہ علیہ السلام کا دور ۲۶۰ برس کا آپ کو معلوم ہے حکومتوں کے ذرائع ،خبر رسانیوں کے طریقے ، جاسوسوں کی کثرت ان سبکے باوجود اس طرح اپنے کام کئے جائیں کہ ان کی تعلیمات تمام و کمال اب تک ہمارے ہاتھ میں رہیں۔اور حکومت وقت کو اپنی تمام قوت کے باجود گرفت کا موقع نہ ملے۔کتابوں کے اوراق دیکھ لیجئے آپ ملاحظہ کیجئے گا کہ کبھی الزام قائم نہیں کیا جا سکا۔اور چونکہ الزام نہیں قائم کیا گیا اس لئے ہمیشہ قتل سے انکار رہا۔اسکے معنی یہ ہوئے کہ گرفت کبھی نہیں ہوسکتی اور اگر گرفت ہوتی تو قتل سے

انکار کی ضرورت نہ پڑتی۔ اس سے بڑھ کر حقانیت کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس سے بڑھکر سیاست کی کامیابی دنیا میں کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ پھر میں یہاں سے کہتا ہوا چلوں کہ اگر یہ سب خطاکار انسان ہوتے تو ۱۲ نمونے ملتے جلتے ہوئے نہ ہوتے۔ ایک ہی مسلک، ایک ہی طریقہ، ایک عنوان نہ کسی کا قدم آگے بڑھا نہ کسی کا قدم پیچھے ہٹا۔ مگر ہم ان کے طریقہ پر قائم نہیں رہے۔ اس کا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اور زمانہ تھا۔ اب اور زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ اس زمانہ میں ایسا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنی زبان کو خاموش کیوں رکھیں اور پورے طور سے اپنے جذبات کو ظاہر کیوں نہ کریں۔ لیکن ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہم نے اس طرز عمل سے فائدہ اٹھایا یا نقصان۔ اس زمانہ میں ہم میں ایسے افراد پیدا ہوئے جن کے حسن عمل کے تذکرے ہم حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

یہ اس زبان بندی کے کارنامہ کا ذکر ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ ہم ایسے ہوگئے ہیں کہ اب یہ کہتے ہوئے ہمیں شرم آتی ہے کہ ہم شیعہ ہیں۔ وہ خط وخال نہیں ہے۔ وہ صورت نہیں، وہ اوصاف نہیں۔ حالانکہ ہم سے کہا گیا تھا۔

کونو لنا لنسینا ولا تکونو اعلینا شینا

یعنی تم ہمارے لئے نیک نامی کا باعث ہونا، بدنامی کا باعث نہ ہونا۔ مگر ہم نے اپنے طرز عمل سے اپنے ائمہ علیہم السلام کی تعلیمات کو بدنام کر دیا۔ ہم نے اپنی قوت عمل کو سلب کر دیا۔ ہم نے بیکار کی زندگی اختیار کر لی۔ رسالت مآبؐ فرماتے ہیں:

نعم العوف علی تقوی الله الغنی

''بہترین مددگار ادائے فرائض الہیہ پر استغنا ہے۔''

ایک انسان اپنے مال کے ذریعہ سے وہ کام کرسکتا ہے جو ایک فقیر انجام نہیں دے سکتا۔

پانچ حدیثیں اسی مضمون کی موجود ہیں۔ اور ملاحظہ ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لا خیر فیمن لا یحب جمع المال من حلال بکف به وجهه ویقضی به دینه ویصل به رحمه

''کوئی اچھا نہیں اس شخص میں کہ جو مال حلال کے جمع کرنے کو پسند نہ کرتا ہو۔ لیکن نہ اس مقصد سے کہ دوسروں پر اپنا تفوق قائم کرے۔ دوسروں کو پست رکھے۔ بلکہ اس غرض سے کہ وہ اپنی آبرو کی حفاظت کرے۔ قرضوں کو ادا کرے۔ اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ وہ جمع آوری مال کی مزرعۂ دنیا ہے۔ جس سے اس طرح کے مصارف اور طریقہ استعمال کی وجہ سے ثمرہ آخرت حاصل ہوگا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا تدع طلب الرزق من حله فانه عون لك علی دینك

دیکھو طریقہ حلال سے رزق حاصل کرنے کو چھوڑنا نہیں۔ یہ نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ کیونکہ یہ تمہارے دین کی تکمیل کے معین ہوگا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

انی لا بغض للرجل ان یکون کسلا نا عن امور دنیاہ و من کسل عن امور دنیاہ فھو عن امر اخرته اکسل

''نفرت ہے مجھ کو اس انسان سے جو کاہل ہو اپنے دنیاوی امور میں۔''

اب ہمارے آرام پسند افراد اس کو سنیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے دشمنی ہے اس امر سے کہ انسان کاہل ہو اپنے دنیاوی امور میں۔ اور جو شخص کہ اپنے دنیاوی معاملہ میں کاہل ثابت ہوا وہ آخرت کے معاملہ میں زیادہ کاہل ہوگا۔ یہ کاہلی اور پست

ہمّتی ہے کہ ہم نے دنیا میں اپنی راحت پسندی کے لئے توکل کا نظریہ قائم کرلیا ہے۔ وہ رزق کا ذمہ دار ہے، ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی کیا ضرورت ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

اصلاح المال من الایمان

''مال کی اصلاح کرنا، اس کی فکر کرنا ایمان کا جزو ہے۔''

مال کی دوقسمیں ہیں:۔ مال منقولہ اور مال غیر منقولہ۔ اگر ہماری جائدادیں محفوظ رہتیں تو ہم تباہ نہ ہوتے۔ لیکن تباہی جو پیدا ہوئی وہ جائدادوں کے ہاتھ سے جانے سے۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ ایسی چیزوں میں ہم کوکس طرح سے سبق دیا گیا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے غلام مصارف سے فرمایا کہ تم کوئی جائداد کوئی کھیتی لے لو۔ اس لئے کہ جب کسی شخص کے پاس کوئی جائداد ہوتی ہے تو اس کے دل کو ڈھارس رہتی ہے۔

ابا بن عثمان کی روایت ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے مجھے بلا کر پوچھا کہ فلاں شخص نے اپنی زمین بیچ ڈالی؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زمین یا کوئی چشمہ جو اسکے پاس موجود ہو (یہ بھی مال غیر منقولہ میں سے ہے) اسے فروخت کرلے اس کی قیمت پھر کسی زمین یا چشمہ ہی میں نہ صرف کرے تو قیمت اس کی برباد ہوئی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مشتری العقدة مرزوق و بایعھا

'' جس نے جائداد خریدی اس کے اوپر رزق کا دروازہ کھلا اور جس نے جائدار فرخت کی اس نے زندگی اکارت کی۔''

مسمع کی روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے میں نے عرض کیا کہ میری ایک زمین ہے اور کچھ لوگ اسے خریدنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: تم کو نہیں معلوم کہ جس شخص نے پانی مٹی یعنی جائداد غیر منقولہ فروخت کی اور اس کی قیمت پھر ویسی ہی جائداد میں نہ صرف کی تو اس کی قیمت بالکل بیکار چلی گئی۔ میں نے عرض کیا۔ میں اس زمین کو زیادہ قیمت میں فروخت کروں گا۔ اور اس سے ایسی زمین کو خیرید کروں گا جو اس سے رقبہ میں وسیع ہے۔ آپ نے فرمایا تب کوئی ہرج نہیں ہے۔ یہ تجارتی معاملات ہیں جو امام علیہ السلام کے سامنے پیش ہورہے ہیں اور آپ اس کا جواب دے رہے ہیں۔ آخر میں آپ حضرات کے سامنے میں ایک حدیث پیش کرتا ہوں جو دنیا اور آخرت کا تعلق بالکل نمایاں کردے گی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

لیس منا من ترك دنیاہ لآخرته ولا اخرته لدنیاہ۔

''ہم سے کوئی سروکار نہیں اس کو کہ جو دنیا کو آخرت کے لیے چھوڑ دے اور نہ اس کو کہ جو آخرت کو دنیا کے لیے چھوڑ دے۔'' کیا اب بھی کہا جائے گا کہ اسلام دینوی ترقی میں سد راہ ہے۔ کیا اب بھی کہئے گا کہ اسلام دنیا کو بیکار بنانے کے لیے آیا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں۔ بلکہ یاد رکھئے کہ دنیا کی بربادی اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کا نتیجہ ہے۔ اگر صحیح ترقی حاصل کرنا ہو تو اسلام اور ائمہؑ مذہب کی تعلیمات پر عمل کیجئے۔ وہ آپ کی سچی ترقی کے ذمہ دار ہیں۔

والسلام

(اشاعت اولی: باہتمام مرزا مرتضیٰ حسین صاحب، سکریٹری بزم عباسیہ، موتی مسجد فیض آباد (سالانہ مجالس فیض آباد ۱۹۳۷ء)

❀❀❀